6

میری تمام سرگزشت.........

شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب

[شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب کے بارے میں اگر کہا جائے کہ وہ اس وقت برصغیر کے سب سے بڑے جلیل القدر استادِ حدیث ہیں تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ ان کا صرف صحیح بخاری شریف پڑھانے کا عرصہ نصف صدی پر مشتمل ہے ملک اور بیرون ملک کے بڑے بڑے شیخ الحدیث آپ کے تلامذہ کے حلقے میں شامل ہیں، حضرت نے اپنی سوانح زندگی املا کرانا شروع کی ہے جسے جامعہ فاروقیہ کے فاضل اور تخصص فی الفقہ کے طالب علم مولوی شمس الحق کشمیری ضبط کرر ہے ہیں، اب تک دوڈھائی سو صفحات ہو چکے ہیں اور یوں خود حضرت کی زبان سے ان کی زندگی کی سرگزشت مرتب ہورہی ہے، اس سرگزشت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ حضرت نے بغیر تصنع وتکلف کے زندگی کے واقعات کو ہو بہو بیان کردیا ہے، بڑے لوگوں کی سوانح پر لکھی جانے والی کتابوں میں عموماً ایک کمی یہ پائی جاتی ہے کہ وہ بچپن ہی سے طبعی زندگی سے ماوراء منفرد دکھائے جانے لگتے ہیں، سوانح نگار غالباً عقیدت کی بنیاد پر ایسا کرتے ہیں لیکن اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا قاری ان کو فطری تقاضوں، طبعی زندگی کی الجھنوں اور گردش لیل ونہار کی ہمہ گیر جکڑ بندیوں سے آزاد دیکھ کر یہ تاثر لے لیتا ہے کہ جو جھمیلے والی زندگی میں گزار رہا ہوں اس میں ان بزرگوں کے نقش قدم پر چلنا ممکن نہیں، وہ ان کی سوانح کو قابل رشک تو سمجھ لیتا ہے، قابل تقلید نہیں............لیکن حضرت نے اپنی اس آپ بیتی میں طبعی زندگی کے واقعات کو بغیر کسی آمیزش کے ذکر کردیا ہے، ابتدائی تعلیم وتربیت اور دارالعلوم دیوبند میں داخلے اور اسباق کی تفصیلات پر مشتمل یہ چھٹی قسط نذر قارئین ہے، امید ہے کہ اسے ذوق وشوق سے پڑھا جائے گا۔ سوانح یا آپ بیتی کا فی الحال یہ نام اس ناکارہ نے علامہ اقبال کے اس مشہور شعر سے اخذ کیا ہے ؎

میں کہ مری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ   میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

(مدیر)]

دارالعلوم دیوبند میں دوسرا سال: دوسرے سال ’’جلالین شریف‘‘، ’’میبذی‘‘، ’’متنبی‘‘ (’’المفتاح‘‘ کا سبق بھی متنبی کے ساتھ ہوا) ’’ملا حسن‘‘ وغیرہ کتابیں پڑھیں ’’جلالین‘‘ کے ساتھ ’’الفوز الکبیر‘‘ کا سبق بھی ہوا۔ اس زمانے میں ’’جلالین‘‘ ایک ہی گھنٹے میں ہوتی تھی۔

اساتذہ کا حسن ظن: حضرت مولانا عبدالحق صاحب مرحوم (جو دارالعلوم حقانیہ کے بانی تھے) ہمیں ’’جلالین‘‘ پڑھاتے تھے۔ ہم ’’جلالین‘‘ کے گھنٹے میں غیر حاضری کیا کرتے تھے۔ ایک روز مولانا نے فرمایا کہ میں رجسٹر میں تمہاری حاضری لگاتا ہوں اس لیے کہ مجھے معلوم ہے کہ تم وقت ضائع نہیں کرتے۔ تمام حضرات کا حسن ظن رہا۔ ویسے امتحانات میں نمبر

اچھے ہوتے تھے، شاید اس وجہ سے حسن ظن تھا۔

''ملا حسن'' ایک بزرگ استاذ مولانا حبیب اللہ صاحب سنبھلی رحمہ اللہ کے یہاں تھی۔ ''میبذی'' پڑھنے والے طلباء کی دو جماعتیں تھیں۔ ایک جماعت کا سبق تیسرے گھنٹے میں مولانا جلیل احمد صاحب رحمہ اللہ کے ہاں تھا (جو ''میبذی'' کے مشہور استاذ تھے) اور دوسری جماعت کا سبق پانچویں گھنٹے میں ایک نئے استاذ آئے تھے، ان کے یہاں تھا۔ ہم نے چونکہ فیصلہ کیا تھا کہ مولانا جلیل صاحب رحمہ اللہ سے نہیں پڑھیں گے (اس لیے کہ انہوں نے ہمارا امتحان امتیازی طریقے سے لیا تھا، ان کی نیت تو یقیناً خیر ہی کی ہوگی، کئی احتمالات اس میں خیر کے نکلتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کو ہم سے کیا کد ہوسکتی تھی) اس لیے ہم نے درخواست دی کہ تیسرے گھنٹے میں ''توضیح وتلویح'' (جو مولانا بشیر احمد خان صاحب کے ہاں تھی) پڑھنے کی اجازت دی جائے اور ''میبذی'' کا سبق ہمارا پانچویں گھنٹے میں کردیا جائے، تو یہاں بھی مولانا اعزاز علی صاحب رحمہ اللہ (نائب ناظم تعلیمات) کو اشکال ہوا۔ اس لیے کہ مولانا جلیل احمد صاحب ''میبذی'' کے مشہور استاذ تھے اور طلباء کی خواہش ہوتی تھی کہ ''میبذی'' انہی سے پڑھیں۔ بہرحال بہت کوشش کے بعد ہماری درخواست منظور ہوگئی اور تیسرے گھنٹے میں توضیح کے ساتھ ''مسلم الثبوت'' کا سبق بھی ہوا۔

اب دوسرا گھنٹہ خالی تھا، اس میں ''تصریح'' کے لیے درخواست دے دی، جو منظور ہوئی۔ ''تصریح'' کے ساتھ ''شرح چغمنی''، ''سبع شداد'' اور ''قلیدس'' تین رسالے بھی پڑھے، اگرچہ اس گھنٹے کے اسباق سے ہم کماحقہ فائدہ نہ اٹھا سکے، اس لیے کہ جماعت بڑی تھی اور اسباق سے فائدہ اٹھانے کے لیے گزرے ہوئے سبق کو دیکھنا اور سمجھنا ضروری ہوتا ہے جو ہم سے نہ ہوسکا۔ اس کے علاوہ شرح عقائد درخواست دے کر خارج میں عصر کے بعد لے لی جو مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمہ اللہ کے پاس تھی، لیکن ہم ان کے سبق میں کبھی نہیں گئے۔ آج تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ کس درسگاہ میں ''شرح عقائد'' کا سبق پڑھاتے تھے۔ حضرت کے سبق میں نہ جاسکنے کی وجہ یہ ہوئی کہ ہماری والدہ نے مخمل کی دوہر سیاہ رنگ کی بنا کردی تھی، جس کو ہم اوڑھا کرتے اور والد صاحب ایک سرخ رنگ کا رومال دلّی سے خرید کر لائے جس کو سر پر باندھا کرتے تھے۔ وہاں کے ماحول میں یہ ہیئت کافی عجیب تھی، مولانا راستے میں کبھی مل جاتے تو گھور کر ہمیں دیکھتے، یقیناً ان کا گھورنا ہمارے اس ماحول میں ہیئت کذائی کے پیش نظر تھا، مگر ہمیں اچھا نہیں لگا، اس لیے ہم ان کے سبق میں گئے ہی نہیں۔ اس طرح ''شرح عقائد'' بھی ہم سے رہ گئی اور فن تجوید کی تین کتابیں ''جزری''، ''خلاصۃ البیان'' اور ''فوائد مکیہ'' کا درس حضرت مولانا قاری حفظ الرحمٰن صاحب سے لیا۔

قاری حفظ الرحمٰن صاحب کا اندازِ درس: قاری صاحب نے کسی کتاب کو پڑھاتے وقت نہ مطلب کبھی بیان کیا نہ یاد کرنے کی تاکید کی۔ فوائد مکیہ تو اردو میں تھی، لیکن جزری اور خلاصۃ البیان میں بھی عبارت پڑھنے پر ہی اکتفاء کیا۔ مشق میں کبھی اظہار، اخفاء، مد، غنہ اور مخارج وصفات پر توجہ کی ضرورت کا احساس نہیں دلایا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ فارغ ہونے کے بعد

قرآن کریم صحیح پڑھنے کی صلاحیت حاصل نہیں تھی، بعد میں اس کمزوری کا احساس ہوا، پشیمانی ہوئی، تو جلسوں کی تلاوت سن سن کر کچھ اصلاح کی۔ اُدھر صدر القراء حضرت مولانا قاری حفظ الرحمٰن صاحب کی درسگاہ احقر کے حجرے کے قریب تھی۔ قاری صاحب موصوف شکار کے شوقین تھے اور ہمارا علاقہ شکار کے لیے بہت مناسب تھا۔ قاری صاحب اس حوالے سے، نیز گرمی کے موسم میں کبھی کبھی جوسّی وغیرہ ہم دوپہر میں پیش کر دیا کرتے تھے، ہم پر بہت مہربان تھے۔ وہ فرماتے کہ تم قراءت کے لیے میرے پاس آیا کرو، ہم کہتے کہ حضرت یہ کام تو وہ لوگ کرتے ہیں جنہیں کتابیں نہیں آتیں، قاری صاحب فرماتے، تمہارا یہ خیال غلط ہے میں کراچی مدرسہ کھڈہ میں معقولات کی بڑی کتابیں پڑھاتا رہا ہوں بعد میں تجوید وقراءت کی طرف آیا ہوں۔ فرماتے تم عجیب آدمی ہو، طلبہ کی شدید خواہش میرے یہاں داخلہ لینے کی ہوتی ہے اور گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے بہت درخواستیں قبول کرنے سے عذر کر دیتا ہوں جبکہ تم سے میں خود کہہ رہا ہوں اور تم تیار نہیں۔ بہرحال اپنی اس حماقت کا خمیازہ آج تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔

میبذی نہ پڑھنے کی وجہ: اس سال ایک عجیب صورت حال یہ پیش آئی کہ داخلے کے بعد اسباق شروع ہونے کو تھے کہ ہم بیمار ہو گئے۔ کچھ دنوں کے لیے گھر چلے آئے، پھر جب صحت یاب ہو کر واپس دارالعلوم پہنچے، تو پہلے دن ''میبذی'' کے سبق میں گئے اور دیکھا کہ مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ (مہتمم دارالعلوم) مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ (ممبر شوریٰ) اور مولانا منظور نعمانی صاحب رحمہ اللہ (ممبر شوریٰ) سبق میں بیٹھے ہیں۔ تحقیق حال پر معلوم ہوا کہ طلباء کی شکایت پر امتحاناً درس سننے آئے ہیں، بہرحال ان کا درس ہمارے پلے بھی نہیں پڑا، دوسرے دن معلوم ہوا کہ ان کی چھٹی ہو گئی اور وہ واپس کلکتہ چلے گئے، اصلاً ''بجنور'' کے رہنے والے تھے، تو ہمارا ''میبذی'' کا سبق کسی اور استاذ کو نہیں دیا گیا، بالآخر مولانا شریف کشمیری صاحب رحمہ اللہ کی تقرری ہوئی اور ''میبذی'' کا سبق ان کو دیا گیا، جبکہ ہم کھڑاؤں پہننے کے شوق میں اپنا پاؤں زخمی کر بیٹھے، جب تکلیف بڑھی تو آپریشن کا فیصلہ ہوا، نتیجہ یہ ہوا کہ ہم کشمیری صاحب کے درس میں شریک نہ ہو سکے، کافی عرصے بعد جب صحت لوٹی تو اپنے کمرے میں چلے آئے، یہ کمرہ ہم نے مدرسے سے دور محلّہ ''کیلا'' میں مسجد کے اندر لے رکھا تھا، بہرحال ایک دن ظہر کے بعد ہم سبق میں شریک ہو گئے۔

مولانا شریف کشمیریؒ کا پرجوش اندازِ تدریس: مولانا کا حافظہ بلا کا تھا، ہر کتاب ان کو زبانی یاد تھی لیکن تقریر اس قدر دھواں دار اور پرجوش ہوتی کہ سماعت پر ناگوار گزرتی، ایک بار طلباء نے بتایا کہ ''حمد اللہ'' کے سبق کے دوران جوش میں کتاب پر اس قدر زور سے ہاتھ مارا کہ اس کے اوراق پھٹ کر ایک طرف جا پڑے، اس لیے ہم نے سبق میں جانا چھوڑ دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ہم ''میبذی'' نہ پڑھ سکے، جب سالانہ امتحان آیا تو ہم نے سترہ کتابوں کا تحریری امتحان دیا، امتحان کی تاریخ یکم سے لے کر بیس تک تھی۔

میبذی کا امتحان اور تشویش: ہمیں ''میبذی'' کے متعلق بہت تشویش ہوئی اس لیے کہ یہ ہم نے پڑھی ہی نہیں تھی اور فن بھی

نیا تھا۔ البتہ میبذی کے امتحان سے پہلے تین دن خالی تھے۔ ہم مولانا غلام محمد صاحب (جو آج کل دارالعلوم کورنگی میں ہوتے ہیں) کے پاس گئے (یہ ''میبذی'' پڑھتے تھے اور اچھے طلباء میں ان کا شمار ہوتا تھا) اور ان سے درخواست کی کہ ہمیں ''میبذی'' کے مشکل مقامات کا تکرار کرادو، یہ عمر میں ہم سے بڑے تھے، غصے میں آ گئے اور کہنے لگے، یہ کوئی پڑھنے کا طریقہ ہے کہ بس امتحانی مقامات یاد کرادو، مجھے معلوم ہے کہ آپ نے اس کا سبق پڑھا ہی نہیں اور اب امتحان دینا چاہتے ہو، بہت برا بھلا کہا، بالآخر ہم مایوس ہو کر مولوی رفیق صاحب کے پاس آئے، یہ بہت قابل بھی تھے اور ''میبذی'' کے حافظ بھی، انہوں نے ''میبذی'' مولانا جلیل احمد صاحب رحمہ اللہ سے پڑھی تھی (جو ''میبذی'' کے مشہور استاذ تھے) اور طلباء نے حضرت مولانا شریف کشمیری رحمہ اللہ سے اصرار کر کے ''میبذی'' پڑھنے کے لیے عصر کے بعد کا وقت بھی لیا تھا تو مولوی رفیق صاحب حضرت کشمیری صاحب رحمہ اللہ کے درس میں بھی شریک ہوتے تھے۔ ابتداءً تو ہم ان سے کہتے ہوئے کتراتے تھے اس لیے کہ ہمارا ان کا مقابلہ بھی رہتا تھا مگر مجبوراً ان سے درخواست کی کہ بھائی امتحان کی کچھ تیاری کرادو، تو انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔ ''میبذی'' کے امتحان سے پہلے جو تین دن خالی تھے ان میں ہم دونوں صبح کو ناشتے کے بعد کتاب لے کر جنگل کی طرف روانہ ہو جاتے تھے، دارالعلوم کے قریب قبرستان کی طرف جنگل میں کئی مسجدیں بھی تھیں تو ارادہ ہوتا تھا کہ کسی مسجد میں بیٹھ کر دوپہر تک تکرار کر لیا کریں گے، مگر ایسا نہ ہو سکا۔ اس طرح تینوں دن جب ہم ناشتہ کر کے نکلے تو راستے میں کسی ایسے مسئلے پر گفتگو شروع ہو جاتی کہ واپسی تک ہم اسی میں الجھے رہے اور تینوں دن کتاب کھولنے کی نوبت نہیں آئی، مولوی رفیق احمد صاحب نے یہ معاملہ ہم سے یا تو قصداً کیا لیکن بظاہر ایسا معلوم نہیں ہوتا، یا پھر وہی طالب علمانہ انداز کہ جس بات پر گفتگو چل رہی ہے وہ بڑھتی چلی گئی تو نتیجہ یہ ہوا کہ امتحان کا دن آ گیا اور ہم نے ''میبذی'' کے ایک مسئلے کا بھی تکرار نہیں کیا تھا، ''میبذی'' کا نصاب الٰہیات تک تھا، تو امتحان میں ایک سوال طبعیات میں سے، ایک فلکیات میں سے اور ایک عنصریات میں سے آیا، ہم نے چونکہ ''تصریح'' شرح چغمنی وغیرہ پڑھیں تھی، اس لیے فلکیات کے مسائل سے کچھ مناسبت ہو گئی تھی چنانچہ فلکیات کا سوال تو ہم نے اپنی ان معلومات کی بنیاد پر حل کیا اور دوسرے سوالات کسی طرح حل کیے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

''میبذی'' کا پرچہ حضرت مولانا عبدالخالق صاحب رحمہ اللہ نے بنایا تھا، جو مزاجاً سخت تھے اور نمبر بھی کم دیتے تھے۔ ہمیں تو پاس ہونے کی امید بھی نہ تھی، پرچہ ہم عربی میں لکھا کرتے تھے، خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ انہوں نے ہمیں 45 نمبر دیئے اور کتابوں میں بھی اچھے نمبر آئے۔

اسی طرح ''جزری'' ہم نے مولانا قاری حفظ الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ سے پڑھی۔ انہوں نے کبھی بھی کسی شعر کا مطلب بیان نہیں کیا۔ شائد ان کو ہم پر اعتماد نہیں تھا، اب جب اس کے امتحان کا نمبر آیا تو اس کی صورتحال بھی ''میبذی'' سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی، صبح پرچہ تھا، رات کو ہم نے اس کی شرح حاصل کی (جو مظاہر علوم سہارنپور کے استاذ قاری

سلمان صاحب نے لکھی تھی، ان کی لوہاری میں رشتے داری بھی تھی) اور عشاء کے بعد احاطۂ دفتر میں ایک چارپائی پر لیٹے ہوئے، صبح تک ہم نے اس کو یاد کرلیا، صبح کو امتحان دیا تو ''جزری'' میں ہمیں پورے پچاس نمبر ملے۔

اسی طرح ''ملاحسن'' کے امتحان کے موقع پر رات میں مولوی رفیق صاحب رحمہ اللہ نے مجھے اور میں نے مولوی رفیق احمد صاحب کو پوری ''ملاحسن'' زبانی سنائی تھی۔

حسن کارکردگی پر مولانا اعزاز علیؒ کے تعریفی کلمات: دوسرے سال کے آخر میں جب تقسیم انعامات کا جلسہ ہوا تو مولانا اعزاز علی رحمہ اللہ نے دو طالب علموں کی تعریف کی اور فرمایا کہ یہ دارالعلوم کے ہونہار اور ممتاز طالب علم ہیں، ایک مولانا نعیم صاحب دیوبندی (جو بعد میں دارالعلوم میں استاذ مقرر ہوئے) اور ایک احقر کا نام لیا۔

دارالعلوم کا اصول یہ تھا کہ کم از کم پانچ کتابوں میں پچاس یا اس سے زائد نمبرات حاصل کرنے والے طالب علم کو خصوصی انعام دیا جاتا (بشرطیکہ وہ کتاب میں فیل نہ ہو) بفضلہ تعالیٰ ہمیں ہر سال یہ خصوصی انعام ملا کرتا تھا۔

دارالعلوم میں تقسیم انعامات کے اس سالانہ جلسے میں اساتذہ دارالعلوم کے علاوہ سہارنپور، میرٹھ، دہلی اور مرادآباد کے علمائے کرام بھی شرکت کرتے تھے۔

☆……☆……☆

سیرت طیبہ……دل کے ہر درد کا درمان

حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف اس عہد میں بلکہ جب تک دنیا باقی ہے، صاحب قرآن کی سیرت وحیاتِ مقدس کے مطالعہ سے بڑھ کر نوعِ انسانی کے تمام امراضِ قلوب وعللِ ارواح کا اور کوئی علاج نہیں۔ اسلام کا دائمی معجزہ اور ہمیشگی کی حجۃ اللہ البالغہ قرآن کے بعد اگر کوئی چیز ہے تو وہ صاحب قرآن کی سیرت ہے اور دراصل قرآن اور حیاتِ نبوت معاً ایک ہی ہیں، قرآن متن ہے اور سیرت اس کی شرح، قرآن علم ہے اور سیرت اس کا عمل، قرآن صفحات وقراطیس مابین الدفتین اور "في صدور الذين أوتوا العلم" میں ہے اور یہ ایک مجسم وممثل قرآن تھا، جو یثرب کی سرزمین پر چلتا پھرتا نظر آتا تھا کماقالت الصدیقۃ رضی الله عنها: "وکان خلقه القرآن"

ما دو جانے آمدہ در یک بدن
من کیم؟ لیلیٰ، و لیلیٰ کیست؟ من

انبیائے کرام کی زندگی سے بڑھ کر ''یقین'' اور ''ایمان'' کی پکار اور کیا ہوسکتی ہے؟ محالِ قطعی ہے کہ ایک صاحب استعداد سیرت نبویہ کا کوئی چھوٹا سے چھوٹا ٹکڑا بھی پیشِ نظر رکھتا ہو اور پھر شک واضطرابِ نفس کا افسونِ ہلاکت اس پر کارگر ہوسکے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جابجا انبیائے کرام علیہم السلام کی نفسِ زندگی و وجود کو بطور حجت و برہان کے پیش کیا ہے، نہ کہ محض بطور قصص، واظہارِ علم ماسبق، وانباء بالغیب کے، جیسا کہ عموماً سمجھا گیا ہے۔ (اقتباس: مولانا ابوالکلام آزاد، کتاب: تذکرہ: 197، 198، انتخاب: سجاد احمد)